POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 17-18 April 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان

اشاعت کا 87واں سال

Date of Publication: 16-04-2026 • Price: 5/- • 22-28 April 2026 • Issue: 16 • Vol:85

۲۲ تا ۲۸؍اپریل ۲۰۲۶ء • شمارہ:۱۶ • جلد:۸۵

بچیوں کے لیے اردو کی دو ادبی کاوشیں

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

اردو ادب کی تاریخ میں متعدد ایسے ادبی اور کارنامے وجود میں آئے ہیں جو گھریلو بچیوں کی بدولت منظرِ عام پر آئے اور پھر وہ اتنے مشہور و مقبول ہوئے کہ ان کے ذکر کے بغیر ہماری ادبی تاریخ ادھوری اور نامکمل قرار دی جائے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے معاشرے پر ان کے اتنے گہرے نقوش و اثرات ثبت ہوئے کہ ان کا آج بھی اعتراف کیا جاتا ہے۔

اولیات کا تذکرہ عموماً کم اہلِ قلم نے کیا ہے۔ ناچیز نے بھی اردو ادب کی ان اولیات کا احاطہ نہیں کیا ہے اور نہ اس تحریر میں ان کا ذکر مقصود ہے۔ زیرِ نظر مختصر سی تحریر میں محض بچیوں کے لیے لکھی جانے والی اس نوع کی دو اہم کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک اردو میں ناول نگاری کے بانی ڈپٹی نذیر احمد (1831-1912) کا ناول 'توبۃ النصوح' ہے اور دوسرے قبال احمد خاں سہیلؔ (1874-1955) کا شہرۂ آفاق نعتیہ قصیدہ 'موجِ کوثر' ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد

اردو کے عناصرِ خمسہ میں ڈپٹی نذیر احمد کا درجہ بہت بلند ہے۔ انھوں نے بے انتہا اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دیں اور آخری سانس تک اردو کا دامن لعل و جواہر سے بھرتے رہے۔ ہماری ادبی تاریخ کے بانیوں میں ہیں، اور وہ انھیں کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ان کی تخلیقات اور تراجم اردو زبان کا بڑا قیمتی ذخیرہ بلکہ سرمایۂ ناز ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد اردو میں ناول نگاری کے بانی و موسس قرار دیے گئے ہیں اور بلاشبہ ان کے ناول ہماری ادبی تاریخ کا ناقابلِ فراموش حصہ ہیں۔ انھوں نے مرأۃ العروس (1869)، بنات النعش (1872)، 'ابن الوقت' اور 'توبۃ النصوح' (1877) جیسے لافانی اور شاہ کار ناول اپنی بچیوں کے لیے لکھے اور پھر وہ گھر گھر میں پڑھے گئے۔ اس سے لوگ بالخصوص بچیاں اور خواتین اس قدر متاثر ہوئیں کہ مولوی نذیر احمد دہلوی کو طبع کرانا پڑا، جسے مطبع نول کشور لکھنؤ نے شائع کیا۔

'توبۃ النصوح': جس وقت یہ ناول لکھا گیا مولوی ڈپٹی نذیر احمد اس وقت ضلع اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر (بندوبست) کے عہدے پر فائز تھے۔ سر سیّد احمد خاں (1817-1898) اسی زمانہ میں ایم اے او کالج کے قیام میں تعاون کے لیے گورکھپور ہوتے ہوئے اعظم گڑھ تشریف لائے اور ڈپٹی نذیر احمد دہلوی ہی کی نظامت و سرپرستی اور راجا سلامت علی خاں کی صدارت میں ویسلی انٹر کالج اعظم گڑھ میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں سرسیّد نے مسلمانانِ اعظم گڑھ کو مخاطب کرکے بڑی بصیرت افروز تعلیمی تقریر کی۔ ان کی تقریر ناچیز کی کتاب 'قد اور سایے' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

یہ سرزمینِ اعظم گڑھ کے لیے ایک فخر کی بات ہے کہ اردو زبان کا ابتدائی ناول اس کی سرزمین پر لکھا گیا۔ ان کے دوسرے ناولوں جن کے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں، اس لیے کہ ان کے ذکر سے ہماری ادبی تاریخیں روشن اور بھری پڑی ہیں۔ یہ ناول نہایت اہم ضرورت کے تحت لکھے گئے۔ خود ناول نگار نے صراحت کی ہے کہ یہ ناول انھوں نے اپنی بچیوں کی تربیت کے لیے سپردِ قلم کیے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے 'مرأۃ العروس' کے دیباچے میں اس کی اہمیت و افادیت، ضرورت اور پھر اس کی مقبولیت کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تحریر یہ ہے:

> ''واضح ہو کہ ہر چند اس ملک میں مستورات کے پڑھانے لکھانے کا رواج نہیں مگر پھر بھی بڑے شہروں میں بعض شریف خاندانوں کی اکثر عورتیں قرآن مجید کا ترجمہ، مذہبی مسائل اور نصائح کے اردو رسالے پڑھ پڑھا لیا کرتی ہیں۔ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں بھی دہلی کے ایک ایسے ہی خاندان کا آدمی ہوں۔
>
> خاندان کے دستور کے مطابق میری لڑکیوں نے بھی قرآن شریف اور اس کے معنی، قیامت نامہ، راہِ نجات وغیرہ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے اردو کے رسالے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے پڑھے، گھر میں رات دن پڑھنے لکھنے کا چرچا تو رہتا ہی تھا، میں دیکھتا تھا کہ ہم مردوں کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو بھی علم کی طرف ایک خاص رغبت ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی مجھ کو یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ نرے مذہبی خیالات بچوں کے مناسب حالت نہیں اور جو مضامین ان کے پیشِ نظر رہتے ہیں، ان سے ان کے دلوں کو افسردگی، ان کی طبیعتوں کو انقباض اور ان کے ذہنوں کو کندی ہوتی ہے۔ تب مجھ کو ایسی کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق و نصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان معاملات میں جو عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات اور جہالت و کج رائی کی وجہ سے ہمیشہ مبتلاے رنج و مصیبت رہا کرتی ہیں۔ ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کے عادات کی تہذیب کرے اور کسی دلچسپ پیرایے میں ہو جس سے ان کا دل نہ اُکتائے، طبیعت نہ گھبرائے مگر تمام کتب خانہ چھان مارا، ایسی کتاب کا پتا نہ ملا پر نہ ملا۔ تب میں نے اس قصے کا منصوبہ باندھا۔
>
> تین برس ہوئے میں جھانسی میں تھا کہ اکبری کا حال قلم بند کیا، لڑکیوں کو تو اس کا وظیفہ ہوگیا اور ہر روز ختم کتاب کا تقاضا شروع کیا، یہاں تک کہ ڈیڑھ برس میں اصغری کا حال بھی لکھا گیا۔ ہوتے ہوتے اس کتاب کا چرچا محلے میں ہوا اور چند عورتیں اس کے سننے کو آئیں، جس نے سنا رُیجھ گئی، اونچے اونچے گھروں میں کتاب منگوائی گئی، نقل لینے کے ارادے ہوئے، اسی اثنا میں بڑی لڑکی کا عقد کردیا گیا اور بطورِ جواہر بیش بہا یہ کتاب میں نے جہیز میں دی۔ اس کی سسرال میں بھی اس کتاب کی شہرت خوب ہوئی۔
>
> جب میں نے دیکھ لیا کہ یہ کتاب عورتوں کے لیے نہایت مفید ہے اور خوب دل لگا کر پڑھتی اور سنتی ہیں، تب اس کو جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر مدراس ممالک شمالی و مغربی کے ذریعے سے سرکار میں پیش کیا۔ سرکار کی قدردانی نے تو میری آبرو اور اس کتاب کی قدر کو ایسا بڑھایا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ میں نے خاطر خواہ اپنی مراد اور محنت کی داد پائی''۔ (مرأۃ العروس، ص:1 تا 3)

اقبال احمد خاں سہیل

مولانا اقبال احمد خاں سہیلؔ (1884-1955) اپنے عہد میں

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کرسکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

نعت نگاری میں امام کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ 'ارمغانِ حرم' سے بھی ان کی انفرادیت واضح ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ مختلف اصنافِ سخن میں مہارت رکھتے تھے اور بقول پروفیسر محمود الٰہی (1930-2014) وہ اردو کے آخری قصیدہ نگار تھے، تاہم نعت نگاری میں ان کے زیادہ جوہر کھلے اور اس میں ان کے عہد میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اقبال سہیل کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کرنے والے شاعر و ادیب اور نقاد افتخار اعظمی (۱۹۳۲-۱۹۹۴ء) نے لکھا ہے:

''دورِ حسانؓ سے لے کر عہدِ جدید تک طبقہ اولیٰ کے نعت گو شعرا کا جو یہ تاریخی سلسلہ ہے، سہیل اسی 'سلسلۃ الذہب' کی آخری کڑی ہیں۔ اقبال کے بعد موجودہ زمانے میں سہیل ہی وہ ذی مرتبت شاعر ہیں جنھوں نے اپنے پیش رو شعرا کی لافانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اردو کی نعتیہ شاعری کے افق کو وسیع تر کیا اور فکر و فن کے اعتبار سے اسے نیا انداز و آہنگ بخشا۔ خاقانی کی طرح انھیں بھی نعت سے فطری مناسبت تھی''۔ (تابشِ سہیل، ص:21)

مولانا سیّد سلیمان ندوی، مرزا احسان احمد، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور بہت سے ادیبوں اور نقادوں نے اقبال احمد سہیل کی نعت گوئی بالخصوص 'موجِ کوثر' میں ان کی عظمت و انفرادیت کا ذکر کیا ہے، لیکن خود شاعر کا خیال ہے کہ میرے نعتیہ قصیدہ 'موجِ کوثر' کے علاوہ فکر و خیال اور فنی اعتبار سے متعدد نعتیں اس سے بہت بلند ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ 'موجِ کوثر' نے جو شہرت و مقبولیت پائی وہ کسی اور نعتیہ کلام کے حصے میں نہیں آئی۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ 'موجِ کوثر' علامہ اقبال سہیل نے اپنی بچی کے لیے لکھی تھی۔ وہ مولانا اسلم جیراج پوری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کو معلوم ہو کہ میں نے زندگی بھر شعر کہے اور کبھی اشاعت کی پروا نہ کی بلکہ دوسروں کی محنت سے جمع شدہ سرمایہ کو بھی ضائع کردیا لیکن یہ نظم جو محض اپنی بچی 'بُرہرہ' کی زنانہ محفل میلاد میں پڑھنے کے لیے لکھ دی تھی اور عزیزی عبدالرؤف مالک 'سودیشی دکان' کے اصرار پر چھپوادی تھی، اس درجہ مقبول ہوئی کہ اب خیال ہوتا ہے کہ کم سے کم نعت و منقبت کا مجموعہ چھپوادوں''۔

(ارمغانِ حرم، ص: ذ)

گویا 'موجِ کوثر' بچیوں کے لیے لکھی گئی تھی۔ یہ بات کوئی اور کہتا تو تعجب کے ساتھ یقین نہیں ہوتا، اس لیے کہ 'موجِ کوثر' میں جس زبان و بیان کو اختیار کیا گیا ہے اور جس طرح کے بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال ہوا ہے، وہ چھوٹی بچیوں کی ذہنی سطح سے بہت بلند ہے۔ اس کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا آج بھی بچے کیا بڑوں کے لیے ایک مشکل عمل ہے اور اس کی تفہیم تو اور بھی مشکل کام ہے۔ بہرکیف اردو ادب کی دو نہایت مقبول کتابیں جس میں ایک نثر میں ہے اور دوسری نظم میں، بچیوں کے لیے لکھی گئیں اور دونوں اعظم گڑھ میں لکھی گئیں، اور دونوں شہرت و مقبولیت کے آسمان پر چمکیں۔

شائستہ منزل، 641، پورہ غلامی، عقب آواس وکاس، اعظم گڑھ-276001، یوپی
E-mail: azmi408@gmail.com
Mob. 9838573645

دوسری اور آخری قسط

'ممنوع موسموں کی کتاب': ایک مطالعہ

ڈاکٹر عبدالسّمیع

کاشف رضا کا تعلق جس شہر سے ہے اسے مہاجروں کا شہر بھی قرار دیا جاتا ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے آباد اس خطے میں صدیوں سے قافلے اترتے رہے ہیں۔ تقسیمِ ہند کے وقت ہندستان کے مختلف حصوں سے نقل مکانی کرنے والے مسلمانوں کا بڑا قافلہ اسی شہر میں اترا تھا، جس کی وجہ سے یہاں کی تہذیب و ثقافت میں اچانک بڑی ہلچل پیدا ہوئی۔ بعد میں مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش سے ہجرت کرنے والوں نے بھی اسی شہر کو پناہ گاہ تصور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہر کا ثقافتی اور تمدنی توازن بگڑ گیا۔ زبان، بود و باش، وضع قطع اور بات چیت میں ایک عجیب قسم کی نیرنگی اور اجنبیت نمو پانے لگی۔ کاشف رضا کی نگاہ میں تاریخ و ثقافت کا یہ منظرنامہ کچھ اس طرح رچ بس گیا ہے کہ وہ اس سے خود کو الگ نہیں کر پاتے۔ وہ صرف اپنی تہذیب و ثقافت کو عزیز نہیں رکھتے۔ جب وہ اس تبدیلی کو ایک بڑے ثقافتی اور انسانی سیاق میں دیکھتے ہیں تو یہ دنیا اور اس کے مقتدرین انھیں منافق اور غیر سنجیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ عام انسان سے لے کر اہل اقتدار تک کی فکری اور ذہنی حالت کا محاکمہ کرتے ہیں۔ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ تہذیب و ثقافت اور حیات انسانی کی تباہی میں حکومت اور اقتدار کے ساتھ فرد اور قوم کا حصہ بھی ہے جس کا اظہار اس کے رویے سے ہوتا ہے۔ اس سیاق میں سیّد کاشف رضا کی نظم 'سفا کی کا دائرہ' ملاحظہ کی جاسکتی ہے جو اپنی بنت، پیش کش اور موضوع کے لحاظ سے انفرادیت رکھتی ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

''ہمارا غصہ
ہمارے نچلے جبڑے کے
گہرے شگافوں سے ناپا جاسکتا ہے
اور ہمارا خوف
ہمارے دل میں
سفید پڑتی ہوئی لہو کی بوند سے

ہم ایک سرخ رومال
جیب میں رکھتے ہیں
اور ایک سفید رومال
ہوا میں لہرا دیتے ہیں

ایک علاقے میں ہمیں ظالم کہا جاتا ہے
دوسرے علاقے میں
ہم خود کو مظلوم کہتے ہیں

ایک علاقے میں ہم پوچھتے ہیں:
''تم کون ہو؟''
دوسرے علاقے میں ہم بتاتے ہیں:
''ہم پونزا بی ہے''[9]

اس نظم میں جس سفا کی کو بیان کیا گیا ہے وہ تہذیبی، سماجی اور ثقافتی سطح پر ہماری تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے۔ ہماری تہذیبی تاریخ میں ظالم اور مظلوم کی حدیں اتنی پیچیدہ ہیں کہ انھیں دو واضح خانوں میں تقسیم کرنا مشکل ہے۔ انسانی تہذیب کی تاریخ انسانی رویوں سے بنتی ہے اور انسانی رویہ کس قدر پیچیدہ ہوتا ہے، اس کی ایک صورت اس نظم میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ انسان اپنی سہولت کے اعتبار سے جنگ اور امن کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ نظم انسان کے اس رویے سے عبارت ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی۔ سیّد کاشف رضا نے اپنی نظموں میں انسان کے اسی دوہرے رویے کو نشان زد کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ رویہ کس قدر خطرناک صورت اختیار کرسکتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس سیاق میں ان کی نظم 'اجتماعی مباشرت' ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ یہ نظم پڑھتے ہوئے بلراج مین را کی کہانی 'ریپ' یاد آتی ہے۔ جہاں مین را کی کہانی ختم ہوگئی تھی یہاں اس سے آگے کا مرحلہ ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

''تاریخ سے اجتماعی مباشرت
ہم نے کھیل سمجھ کر شروع کی
پھر شور بڑھتا گیا
اور ہمارا شوق دیکھ کر
ہماری بریدہ تاریخ
ہماری زوجیت میں دی گئی
اب اس کے بچے کتوں سے زیادہ ہیں''[10]

یہ نظم جس برہنہ حقیقت کی تصویر پیش کرتی ہے، اس سے ہمارا سامنا آئے دن ہوتا ہے۔ تاریخ اور تہذیب کے ساتھ کھلواڑ کے نتائج جس صورت میں ہمارے سامنے آرہے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ سیّد کاشف رضا کے یہاں تہذیب اور تاریخ کا تصور جس تقدیس اور احترام سے تشکیل پاتا ہے وہ اس کا تقاضا دوسروں سے بھی کرتے ہیں۔ اس نظم سے ہمارے اس سماجی رویے کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اجتماعی مباشرت کا عمل کھیل اور تفریح کے لیے انجام دیا جاتا ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ انسان کی دسترس تاریخ پر ہوجائے اور وہ اس بات پر بھی قادر ہوجائے کہ اس میں چھیڑ چھاڑ کرسکے تو ہر انسان اپنی سہولت کے اعتبار سے اس میں ترمیم و اضافہ کرتا نظر آئے گا۔ انسان کے اس عمل سے مستقبل کے تاریک ہونے کا اندیشہ بڑھ جائے گا۔ اس نظم کی قرأت مختلف طریقوں سے مختلف سیاق میں کی جاسکتی ہے۔ اس کا لفظیاتی نظام اور اس کے معاشرتی اور ثقافتی پہلو بھی قاری کو متوجہ کرتے ہیں۔ اس مختصر نظم کو سیّد کاشف رضا کا فنی معجزہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ بات پہلے بھی کہی جاچکی ہے کہ سیّد کاشف رضا کو اپنے شہر کراچی کی ہر چھوٹی بڑی چیز متوجہ کرتی ہے اور اس کے ہر مسئلے پر وہ اپنی ایک رائے رکھتے ہیں۔ بڑے شہر کے مسائل میں قبرستان، تدفین اور تجہیز و تکفین کا مسئلہ بھی اہم مسئلے کی صورت اختیار کرچکا ہے۔ بڑا شہر جیسے اقتصادی اور معاشی شہر ہونے کا دعوا ہو، وہاں ہر چیز کاروبار کی نذر ہوجاتی ہے۔ اس سیاق میں سیّد کاشف رضا کی نظم 'کراچی ڈیتھ سروس' ایک اہم نظم کہی جاسکتی ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

''زندگی سے موت تک
ایک کڑی مسافت ہے
ہم اسے سہولت سے طے کراتے ہیں
اور آپ سے تیس روپے فی گولی
قیمت بھی نہیں لیتے

آپ کے لیے ہم
پٹ سن کی گانٹھوں سے
کفن تیار کرتے ہیں
جس کی خوشبو نیند آور ہوتی ہے

ہمارے رضا کار
آپ کی لاش اٹھاتے ہیں
اور ہماری ایمبولنس
آپ کے لیے ٹریفک کو چیرتی ہوئی نکلتی ہے

ہمارے اسپتال میں
آپ کے گردے نکالنے کی کوشش نہیں کی جاتی
اور ہم اپنے اندھوں کو بھی
اندھا بنے دیتے ہیں

ہم آپ کے لواحقین کو ڈھونڈ نکالتے ہیں
اور آپ کی تعزیت میں
سبقت حاصل کر لیتے ہیں

اخبارات آپ کی موت پر
ہمارے سوگ کا اعلان
نمایاں مقام پر شائع کرتے ہیں
تاریخ میں آپ کا نام محفوظ ہو جاتا ہے
خدا آپ کو جنت میں جگہ عطا کر دیتا ہے''[11]

حسن اور عشق شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔ حسن کے بیان اور اس کی تعبیر و تفہیم ہمارے شاعروں کا محبوب مشغلہ بھی ہے۔ ایک عرصے تک شعر کو حسن کی دریافت اور بازیافت کا وسیلہ اور اس کے بیان کا ذریعہ تصور کیا جاتا رہا ہے۔ شاعر اسی وقت شاعر تسلیم کیا جاتا ہے جب وہ حسن کے ادراک کا کوئی نیا اور اچھوتا زاویہ تلاش کر لے۔ اسی لیے ایک زمانے تک شاعری کے لیے رومان بطور مترادف پسندیدہ لفظ رہا ہے۔ سیّد کاشف رضا کا ادبی کمٹمنٹ تہذیب و ثقافت اور سماج و معاشرے کے ساتھ ہے لیکن وہ حسن اور عشق سے بھی اتنی ہی رغبت اور دلچسپی رکھتے ہیں جس قدر انھیں اپنا تہذیبی سرمایہ اور جغرافیائی مظاہر عزیز ہیں۔ انھوں نے مقدمے میں اپنے تصور حسن پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور وہ صرف چہرے کو حسن کا مرکز و محور تصور نہیں کرتے۔ ان کی نظموں کا ایک حصہ حسن اور محبت کے بیان سے عبارت ہے۔ ایسی نظموں میں محبت اور عشق کے جذبات کچھ اس وفور کے ساتھ نظم ہوئے ہیں کہ ان پر خالص رومانی شاعر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ وہ محبت کے جذبے کو ایک خاص رومانی لب و لہجے میں پیش کرتے ہیں۔ جذبے اور رومان سے لبریز ایک نظم 'مجھے وہ لباس پسند ہیں' بطور مثال ملاحظہ کیجیے:

''مجھے وہ لباس پسند ہیں
جن میں سے تم
ابھی ابھی نکل کر باہر گئی ہوئی ہو
اور کرسیاں جن سے تمھاری مہربان پیٹھ ابھی ابھی اٹھی ہو
اور پردے جنھیں
تمھارے ہاتھ چھوتے چلے گئے ہوں
اور الماریاں اور سنگھار میز
جو تمھاری سانسیں اپنی حفاظت میں رکھتے ہیں
اور الماری میں کپڑے
جو تمھیں سمیٹنے کی تمنا میں بے قرار ہو رہے ہوں
اور لباس جن میں تم
داخل ہونے کا ارادہ کر لیتی ہو''[12]

'نیا عہد نامہ' بھی محبت اور رومان کے جذبے سے سرشار ایسی ہی نظم ہے جس میں مطالبے کی ایک ایسی کوشش نظر آتی ہے جس میں دلچسپی اور حیر تنا کی کے عناصر واضح ہیں۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

''نہ لکھی ہوئی زمین چاہیے نہ اوڑھا ہوا آسمان
نہ ٹوٹے ہوئے لفظ چاہئیں
نہ چاہی ہوئی عورت
نہ رنگ چاہئیں سنگ سار کیے جا چکے
نہ پھول جنھیں روشنیاں چوم چکیں
نہ کھیت جنھیں سورج دیکھ چکے
نہ فصلیں جنھیں زبانیں چکھ چکیں
نہ دیواریں جن کے کان پک چکے
نہ لفظ جو اپنے ڈھول پیٹ چکے
نہ لفظوں کے معنی سے میثاق
جو پورے نہیں ہوئے
نہ جملے جن کے دروبست سے سیمنٹ اکھڑ چکا
نہ شریانیں جن میں لہو سست پڑ گیا
نہ درخت جو ہواؤں کی صحبت میں آوارہ ہو چکے
نہ ہوائیں جو سانسوں میں تقسیم ہو چکیں
نہ پہنے ہوئے لباس چاہئیں
نہ کاٹے ہوئے سفر
نہ برتی ہوئی زندگی
کاغذ پر بس ایک زبور چاہیے
جو میں نے تمھارے جسم سے پڑھی''[13]

محبت میں ایثار اور خود سپردگی کا جذبہ قابل قدر تصور کیا جاتا ہے۔ سیّد کاشف رضا نے اس جذبے کو اپنی نظم 'وہ اتنی خوب صورت ہے' میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

''وہ اتنی خوب صورت ہے کہ
میں اس کے گالوں میں
باتیں بننے کے عمل کو
دیکھتا رہ جاتا ہوں
اور اس کے ہونٹوں کو چھو کر
نکلتی ہوئی آوازوں کو
پکڑتا رہ جاتا ہوں
اور بھول جاتا ہوں کہ
اس کی باتوں کا کوئی
مطلب بھی ہو سکتا تھا
سوائے مجھے اپنے
گالوں اور ہونٹوں کے
مختلف کمپی نیشن دکھانے کے
وہ اتنی خوب صورت ہے کہ
میں اس کے سینے میں
ایک میخ گاڑنا چاہتا ہوں گا
جو میرے سینے میں
پہلے ہی گڑی ہوئی ہے
وہ اتنی خوب صورت ہے کہ
میں اس کے پیروں میں
ضائع ہونا چاہوں گا
اگر میں اس کے ہاتھوں سے گرا دیا جاؤں
ورنہ میں چاہوں گا
اس کے نازک ہاتھوں میں منتقل ہونا
جیسے ایک محبت
ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی ہے
یا ایک لاش!''[14]

ایثار اور خلوص جذبۂ عشق کے اہم عناصر ہیں۔ ان کے بغیر عشق کا کوئی بھی تصور بامعنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہماری شعری روایت میں ایثار اور خلوص کو جس طرح سے برتا گیا ہے، اس کی مثال عالمی ادب میں بھی مشکل سے ملے گی۔ سیّد کاشف رضا کے یہاں ایسی کئی نظمیں مل جاتی ہیں جن میں ایثار اور خلوص کو جذبۂ عشق کو اہم عنصر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

سیّد کاشف رضا نے عشق کے جذبے کے ساتھ اس کے اہم کرداروں کو بھی اپنے تخلیقی تجربے سے گزارا ہے۔ عشق کے کرداروں میں عاشق، معشوق اور رقیب کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ قاصد، ندیم وغیرہ بھی اس کے ذیلی کرداروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ عشق کے تین اہم کرداروں پر مبنی کاشف رضا کی نظم 'میں، وہ اور اس کا خدا' ایک دلچسپ اور کسی قدر منفرد نظم ہے۔ اس نظم میں وہ تمام جذبات محسوس کیے جا سکتے ہیں جن کا تعلق عشق اور اس کی تثلیث سے رہا ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

''عبادت کرتے ہوئے
وہ یک سو نہ ہو سکی
اس کے دھیان کے اس حصے میں. جہاں خدا کو ہونا چاہیے تھا
میں موجود تھا

پھر بھی کچھ جگہ بچ رہی
جہاں خدا موجود رہا
میں نے اپنے ساتھ اس کی قربت کو
بڑی دلچسپی سے محسوس کیا

بچ رہنے والی جگہ میں
خدا
بوڑھے آدمی کی خشونت کے ساتھ
موجود رہا

عبادت کرتے ہوئے
اس نے جو دعائیں مانگی تھیں
خدا کی بارگاہ میں مسترد کر دی گئیں''[15]

سیّد کاشف رضا کی نظموں کے اس مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں نظم گوئی کا ایک خاص سلیقہ موجود ہے اور ان کی نظم کا کینوس انسانی تاریخ، تہذیب اور معاشرے کے ساتھ انسانی جذبات و محسوسات کو محیط ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیّد کاشف کی نظم نگاری اردو کے معاصر شعری منظرنامے پر ایک خوشگوار اور تازہ ہوا کا حکم رکھتی ہے۔

حوالے

1- ممنوع موسموں کی کتاب، سیّد کاشف رضا، کراچی: شہرزاد، 2012، ص؛9
2- ایضاً، ص؛10
3- ایضاً2، ص؛10-11
4- ایضاً، ص؛11
5- ایضاً، ص؛13
6- ایضاً، ص؛13
7- ایضاً، ص؛15
8- ایضاً، ص؛28-29
9- ایضاً، ص؛18-19
10- ایضاً، ص؛22
11- ایضاً، ص؛30-31
12- ایضاً، ص؛43
13- ایضاً، ص؛44-45
14- ایضاً، ص؛100-101
15- ایضاً، ص؛92-93

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی
E-mail: abdussami0543@gmail.com

اردو دُنیا

اردو اساتذہ کی خالی جگہوں کو فوری پُر کرنے کا مطالبہ

جگتیال (31 مارچ)۔ پی آر ٹی یو ٹی ایس جگتیال ضلع شاخ نے مطالبہ کیا ہے کہ اردو میڈیم اساتذہ کی وہ جگہیں جو ریزرویشن امیدواروں کی عدمِ دستیابی کے باعث خالی پڑی ہیں، اُنھیں کیری فارورڈ کرنے کے بجائے فوری طور پر پُر کیا جائے۔ یہ مطالبہ پی آر ٹی یو ٹی ایس جگتیال ضلع شاخ کے صدر بوئن پلی آنندرا اور جنرل سکریٹری یالا امرناتھ ریڈی نے محمد عبداللطیف، اسکول اسسٹنٹ (سوشل)، گورنمنٹ ہائی اسکول کاظمی پور، جگتیال کی سبک دوشی کے موقعے پر منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو میڈیم پرائمری اسکولوں میں ایل ایف ایل ہیڈ ماسٹر (LFLHM) کے عہدوں کو بھی منظور کیا جانا چاہیے تا کہ اردو میڈیم تعلیمی اداروں کا نظام مزید موثر اور مضبوط بنایا جاسکے۔ اس موقعے پر مقررین نے محمد عبداللطیف کی طویل تدریسی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران خلوص، دیانت داری اور لگن کے ساتھ تعلیمی میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ بعدازاں انھیں شاندار انداز میں اعزاز سے نوازا گیا۔ اس تقریب میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر عبدالحفیظ، سابق ہیڈ ماسٹر سرینواس، رحیم، جماعتِ اسلامی ہند جگتیال ضلع کے صدر شعیب الحق، اساتذہ سرینواس، خطیب الدین، فہیم الدین اور دیگر افراد نے شرکت کی۔ (رہنماے دکن۔حیدرآباد)

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی میں ترجمہ نگاری پر سیمینار

حیدرآباد (26 مارچ)۔ عہدِ قدیم سے انسانی تمدن کی ترقی اور تہذیبی تغیر و تبدیلی میں فنِ ترجمہ نے غیرمعمولی کردار ادا کیا ہے۔ مصر، یونان اور روم کی قدیم ترین تہذیبوں کے علمی و ثقافتی سرمایے سے دنیا محروم ہی رہ جاتی اگر انھیں ترجموں کے ذریعے اگلی نسلوں تک منتقل نہیں کیا جاتا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ کی جانب سے منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ارجمند آرا نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ سیمینار کا مرکزی موضوع 'ترجمہ اور تغیر: زبان، ثقافت اور سماج کے باہمی روابط کا مطالعہ' تھا۔ پروفیسر ارجمند آرا نے اس موضوع پر کلیدی خطاب کیا۔ انھوں نے اپنے خطاب مزید کہا کہ عہدِ وسطیٰ میں اگر عرب یونان کے فلسفے اور علوم کو عربی زبان میں منتقل نہ کرتے تو آج دنیا ارسطو اور افلاطون کے ناموں سے بھی واقف نہیں ہوسکتی تھی۔ ترجمے کا عمل انسانی تہذیب اور ثقافت کے تسلسل اور ترقی کا سب سے اہم وسیلہ رہا ہے۔ وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پروفیسر سیّد عین الحسن نے سیمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے کہا کہ علمی دنیا کبھی بھی ترجمے سے صرفِ نظر نہیں کرسکتی اور دنیا کے ہر بڑے ادیب نے اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں ترجمہ ضرور کیا ہے۔ وائس چانسلر نے ترجمے کی اہمیت، ترجمہ اور ثقافت کے باہمی تعلق اور ترجمے کی حرکیات پر نہایت بصیرت افروز نکات بیان کیے۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر علی رفاد فتیحی نے کہا کہ ترجمہ محض ایک لسانی سرگرمی نہیں بلکہ ایک مکمل ثقافتی عمل ہے جس میں ایک زبان کی ثقافت دوسری زبان کی ثقافت میں ڈھل جاتی ہے۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر باراں فاروقی نے اپنے خطاب میں کہا کہ مختلف ثقافتوں میں زبان کے الفاظ اپنے مخصوص معنی کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں، انھیں جب دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے تو وہ معنی باقی نہیں رہ پاتے، اس لیے زیرِ ترجمہ زبان کو اپنے معنوی سیاق کے ساتھ نئے الفاظ وضع کرنے پڑتے ہیں۔ اس موقعے پر انھوں نے فیض احمد فیضؔ کی نظموں کو انگریزی زبان میں ترجمے کے اپنے تجربات بھی بیان کیے۔ مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے تشریف لائے ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے اردو زبان میں الفاظ کی وسعت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں الفاظ سازی کے لیے جو اصول بنائے گئے تھے ان کی مدد سے ہم آج بھی مختلف نئے الفاظ تراش سکتے ہیں اور ہر قسم کے مضامین کو اردو میں آسانی کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ قبل ازیں افتتاحی اجلاس میں صدر شعبۂ ترجمہ پروفیسر خالد مبشر الظفر نے خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے تمام مہمانوں اور شرکا کا استقبال کیا۔ سیمینار کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر سیّد محمود کاظمی نے سیمینار کا تعارف پیش کیا، جب کہ اسکول براے السنہ، لسانیات و ہندستانیات کی ڈین پروفیسر گلفشاں حبیب نے اسکول اور اس کے مختلف پروگرام اور کورسز کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر فہیم الدین احمد نے افتتاحی اجلاس کی نظامت کی اور ڈاکٹر کہکشاں لطیف نے اظہارِ تشکر کا فریضہ انجام دیا۔ (رہنماے دکن۔حیدرآباد)

ساہتیہ اکادمی کی جانب سے تین ممتاز ادیبوں کو 'مہتر رکنیت' دینے کا اعلان

اردو میں عبدالصمد، اُڑیا میں ڈاکٹر پرتیبھا راے اور سندھی میں لکشمی کھلانی کو اعلاترین ادبی اعزاز

نئی دہلی (یکم اپریل)۔ ساہتیہ اکادمی نے تین نامور ادیبوں کو اپنے اعلاترین ادبی اعزاز 'مہتر رکنیت' دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ فیصلہ ساہتیہ اکادمی کی جنرل کونسل کی میٹنگ میں منظور کیا گیا۔ اعلان کے مطابق اڑیا زبان کی معروف ادیبہ ڈاکٹر پرتیبھا راے، سندھی کے ممتاز ادیب لکشمی کھلانی اور اُردو کے مشہور ادیب عبدالصمد کو اس باوقار اعزاز سے نوازا جائے گا۔ ساہتیہ اکادمی جو وزارتِ ثقافت، حکومتِ ہند کے تحت کام کرتی ہے، کی جانب سے دیا جانے والا یہ اعزاز ملک کا سب سے بڑا ادبی اعزاز تصور کیا جاتا ہے۔ یہ اعزاز عموماً اُن شخصیات کو دیا جاتا ہے جنھوں نے ہندستانی ادب میں غیرمعمولی خدمات انجام ہوں۔

ڈاکٹر پرتیبھا راے ایک معروف اڑیا ادیبہ اور دانشور ہیں، جنھیں پدم بھوشن، گیان پیٹھ ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور سارلا ایوارڈ سمیت متعدد اہم اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد 50 سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ لکشمی کھلانی ایک ممتاز سندھی افسانہ نگار، ڈراما نگار، مترجم اور مدیر ہیں۔ ان کی دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ سمیت کئی اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔

عبدالصمد اُردو کے معروف ادیب اور شاعر ہیں جن کی تخلیقات کا دائرہ بھی دو درجن سے زیادہ کتب پر مشتمل ہے۔ انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، بھارتیہ بھاشا پریشد ایوارڈ اور اردو اکادمی کا لائف ٹائم اچیومنٹ اعزاز بھی مل چکا ہے۔ ساہتیہ اکادمی نے ان ممتاز ادیبوں کو 'مہتر رکنیت' دینے پر مسرت کا اظہار کیا ہے۔ یہ اعزاز ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا جائے گا۔ (انقلاب۔دہلی)

اردو میڈیم گورنمنٹ ہائی اسکول نظام آباد کی گولڈن جوبلی تقریب

نظام آباد (31 مارچ)۔ گورنمنٹ ہائی اسکول دھاروگلی نظام آباد اردو میڈیم میں 75-1974 میں ایس ایس سی بیچ کے طلبہ کی 50 سالہ گولڈن جوبلی کی تکمیل کے موقعے پر 'گیٹ ٹوگیدر' تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس پروگرام کی صدارت عثمان ایگریکلچر سائنٹسٹ نے کی اور احمد علی خاں سینئر جرنلسٹ نے اس پروگرام کو آرگنائز کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ اس پروگرام میں 1975 کے ایس ایس سی بیچ کے قدیم طلبہ نے شرکت کی جس میں محمد فصیح الدین شالیمار، ایم اے حفیظ ریٹائرڈ محکمہ آر اینڈ بی، یوسف انصاری، محمد حمید خاں، سیّد احمد بخاری ریٹائرڈ ٹیچر، محمد ابراہیم منشی، اعجاز اللہ خاں، معین صدیقی، ایم اے صمد، محمد مزمل، محمد وہاب ریٹائرڈ محکمہ ٹرانسکو، مرزا ادریس بیگ، مرزا کلیم اللہ بیگ، سیّد ارشد حسینی، محمد احمد ہمدرد، مرزا رحیم بیگ، ایم اے رؤف کے علاوہ محمد واجد حسین ریٹائرڈ ایگریکلچر، انجینئر شہنواز احمد خاں شیراز، محمد فہد خاں، محمد اسرار احمد بودھن، محمد اکرام حسین نے شرکت کی۔ تقریب کے آغاز پر متوفی ساتھی طلبہ کے لیے دعاے مغفرت کی گئی۔ اس موقعے پر شریک تمام سینئر طلبہ نے ایس ایس سی کی تکمیل کے 50 سال کے موقعے پر ایک دوسرے کو بغل گیر ہوکر مبارک بادیاں پیش کیں اور گذشتہ 50 برسوں کے دوران اپنی اپنی زندگی کے نشیب و فراز اور خوشگوار لمحات کی یاد تازہ کرتے ہوئے تفصیلات کو بیان کیا اور برسوں بعد ایک دوسرے سے ملاقات پر اپنی خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔ (رہنماے دکن۔حیدرآباد)

الفاروق پبلک اسکول میں تعلیمی کانفرنس اختتام پذیر

اعظم گڑھ (یکم اپریل)۔ اعظم گڑھ کے موضع کھٹہنہ کے الفاروق پبلک اسکول میں منعقدہ 'عقاب تعلیمی کانفرنس 0.2' ایک تاریخی، باوقار اور نہایت کامیاب علمی اجتماع کے طور پر اختتام پذیر ہوئی۔ نظامت کے فرائض سمیع اللہ علیگ نے نہایت عمدگی سے انجام دیے۔ خصوصی خطابات میں مولانا انور داؤدی، پروفیسر نسیم اختر، ڈاکٹر سادات سہیل اور پروفیسر شارق نعمانی نے تعلیم کے موضوع پر فکر انگیز گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم انسان کو شعور، کردار اور مقصدِ حیات عطا کرتی ہے اور یہی ایک مہذب معاشرے کی بنیاد ہے۔ مولانا عمر اسلم اصلاحی نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ علم وہ روشنی ہے جو فرد کو اندھیروں سے نکال کر کامیابی کی راہوں پر گامزن کرتی ہے، اس لیے نئی نسل کو دینی و عصری تعلیم کے امتزاج پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انجینئر طارق اعظم نے اپنے خطاب میں کہا کہ آج کے دور میں تعلیم ہی اصل سرمایہ ہے، جو نوجوانوں کو خودکفیل بناتی ہے اور قوم کو ترقی کی راہ پر لے جاتی ہے، لہٰذا ہمیں تعلیم کو ترجیح دینی چاہیے، جب کہ مولانا طاہر مدنی نے اپنے پُراثر کلمات میں فرمایا کہ اگر ہم اپنی آنے والی نسلوں کو مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں انھیں علم، اخلاق اور کردار کی دولت سے مالا مال کرنا ہوگا، یہی کامیابی کا حقیقی راستہ ہے۔ الفلاح بلڈ ڈونیشن گروپ کے بانی ذاکر حسین نے خون کے عطیے کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے عوام سے اپیل کی کہ وہ اس انسانی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

اس موقعے پر علاقے میں نمایاں سماجی خدمات انجام دینے والے افراد کو اعزازات سے نوازا گیا۔ اسکول ٹاپر نائف عادل کو ڈاکٹر شمیم احمد خاں اسکالرشپ سے نوازا گیا، جب کہ 100 فیصد حاضری اور بہترین تعلیمی کارکردگی پر حبیبہ عظمت کو سائیکل پیش کی گئی۔ اس موقعے پر پرنسپل ڈاکٹر محمد ذیشان نے اسکول کی جامع رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ادارہ KG کے بچوں کی خصوصی تربیت کے ساتھ ساتھ ضلعی اور قومی سطح کے مختلف مقابلوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل کر رہا ہے جو ایک روشن تعلیمی مستقبل کی نوید ہے۔ (سیاسی تقدیر۔دہلی)

◆◆◆

انجمن ترقی اردو ضلع بھاگل پور، سارن اور مدھوبنی کمیٹیوں کی منظوری

پٹنہ (4 اپریل)۔عبدالقیوم انصاری (سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار) کے ذریعے انجمن ترقی اردو ضلع بھاگل پور، سارن اور مدھوبنی کمیٹیوں کی تشکیلِ نو کی گئی جس کی تفصیلات درجِ ذیل ہیں:

ضلع بھاگلپور: مولانا سیّد شاہ فخرِ عالم حسن (صدر)، منظر عالم ایڈوکیٹ، محمد شاہد، اقدم صدیق، سیّد اسد اقبال رومی، پروفیسر شہاب الدین (نائب صدور)، مولانا زاہد حلیمی قاسمی (سکریٹری)، مفتی عفان عباسی، سیّد احمد، حاجی محمد اشعر، شہباز التمش، محمد نور اللہ، محمد مجاہد (جوائنٹ سکریٹریز)، محمد ریحان قاسمی، محمد تنویر عالم، ماسٹر محمد آصف، محمد وزیر، کلیم اشرف، شاہد اختر مفتاحی، محمد عفان، محمد عین الحق، مولانا سعد اللہ، محمد اکرم، حافظ محمد قیس اور مفتی علی اصغر (ممبرز)۔

ضلع سارن: محمد علاء الدین (صدر)، مفتی ولی اللہ قادری، اکرام احمد، خورشید نیّر، مولانا صابر، وحید الحق (نائب صدور)، سفارت حسین (سکریٹری)، لطیف الرحمٰن، پرویز، سمیع الزماں، محمد معین الحسن، مولانا شمیم احمد، حافظ محمد ارسلان (جوائنٹ سکریٹریز)، محمد ارمان قریشی، محمد تابش عالم، شاہد، بابر خاں، مقصود عالم، ایڈوکیٹ یونس، محمد علی، اکرام الحق، منیر علی، محمد فیروز، نصیب الحق اور مولانا داؤد (ممبرز)۔

ضلع مدھوبنی: ڈاکٹر مرغوب عالم (صدر)، ڈاکٹر جاوید احمد، ماسٹر انوار الحق، پروفیسر عقیل احمد، محمد عصمت اللہ اور محفوظ الرحمٰن سلفی (نائب صدور)، اسحاق احمد کریمی (سکریٹری)، ڈاکٹر سجاد منظر، شاکر احمد، محمد اظہر الدین، محمد کمال الدین اور محمد خیام (جوائنٹ سکریٹریز)، ارشاد عالم، محمد مسیح اللہ، محمد افضل، سراج صالحین، محمد عامر، محمد پرویز، محمد قمر عالم، محمد رضوان احمد، جنت الفردوس، ڈاکٹر جمیل، ولی احمد، سرفراز احمد اور لطف الرحمٰن (ممبرز)۔ (روزنامہ 'پندار'۔پٹنہ)

ممتاز ماہرِ تعلیم احمد رشید شیروانی کی حیات و خدمات پر یادگار تقریب

نئی دہلی (6 اپریل)۔ بھارت سیوا ٹرسٹ اور شیروانی فیملی کی جانب سے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، نئی دہلی میں ممتاز ماہرِ تعلیم احمد رشید شیروانی کی حیات وخدمات کی یادگاری تقریب منعقد کی گئی۔ واضح رہے کہ احمد رشید شیروانی کا انتقال 23 فروری 2026 کو حیدرآباد میں ہوا تھا۔ تقریب کا آغاز ان کی بیٹی آمنہ شیروانی کے جذباتی خطاب سے ہوا، جس میں انھوں نے اپنے والد کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اے.آر. شیروانی نے مختلف فکری اور سیاسی دھاروں سے گزر کر اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی۔ وہ کبھی کمیونسٹ نظریات سے وابستہ رہے، کبھی کانگریس کے قریب رہے اور یہاں تک کہ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے تئیں بھی ان کے دل میں ہمدردی پائی جاتی تھی۔ آمنہ کے مطابق ان کے والد ہندوؤں کے جذبات کو بخوبی سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے ان کے دل میں بے پناہ محبت تھی۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اس مقصد کے لیے وقف کر دی کہ مسلمان اس ملک کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید اور مثبت کردار ادا کریں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ملک ہے تو ہم سب ہیں اور اسی سوچ کے تحت انھوں نے ذاتی زندگی پر قومی مفاد کو ترجیح دی۔

بہار کے گورنر عارف محمد خاں نے کہا کہ احمد رشید شیروانی نے ہماری زندگیوں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ طویل عرصے تک وہ ہماری یادوں اور ذہنوں میں زندہ رہیں گے۔ سابق مرکزی وزیر سلیم اقبال شیروانی نے اپنے چچا کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی رنگارنگ شخصیت ہی ان کی سب سے بڑی پہچان تھی اور وہ غیر معمولی طور پر بذلہ سنج انسان تھے۔ میں نے انھیں زندگی میں کبھی مایوس نہیں دیکھا۔ وہ مایوسی اور نامرادی کے لمحات کو بھی رنگین بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ سینئر صحافی شاہد صدیقی نے کہا کہ وہ ان کی نسل کے لیے ایک بڑے رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد یا تو پاکستان منتقل ہو گئی تھی یا یہاں اپنے تشخص کے اظہار سے بھی خوف زدہ رہتی تھی۔ ایسے مشکل حالات میں اے. آر. شیروانی نے نہ صرف مسلمانوں کے مسائل کو اجاگر کیا بلکہ ان میں حوصلہ اور اعتماد بھی پیدا کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر خواجہ محمد شاہد نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک آزاد خیال، وسیع النظر اور کھلے ذہن کے مالک تھے اور ہمیشہ مسلم بچوں کی تعلیم کے لیے بے حد فکر مند رہتے تھے۔ سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ شیروانی صاحب کو میں نے تقریباً چالیس برس تک ایک صحافی کے طور پر قریب سے دیکھا۔ ان کی سب سے نمایاں خوبی ان کی جرأت مندی تھی۔ وہ جس کمیونٹی میں رہتے تھے، اس کی کمزوریوں کی نشاندہی کرنے سے نہیں جھجکتے تھے۔

اس موقعے پر ایڈوکیٹ اعجاز مقبول، صحافی جاوید انصاری، مہیش شرما، علیزہ نور خاں، سعید اور اعجاز نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ پروگرام میں جن اہم شخصیات نے شرکت کی ان میں سابق چیف الیکشن کمشنر ایس. وائی. قریشی، سابق مرکزی وزیر سلمان خورشید، انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے سابق صدر سراج الدین قریشی، ذاکر حسین دہلی کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر اسلم پرویز اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آخر میں شیروانی صاحب کی چھوٹی بیٹی آسیہ شیروانی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (انقلاب۔دہلی)

سینٹ اسٹیفنس کالج میں سہ روزہ اردو فیسٹول 'کہکشاں' کا انعقاد

نئی دہلی (3 اپریل)۔سینٹ اسٹیفنس کالج کی اردو سوسائٹی بزمِ ادب کے زیرِ اہتمام سہ روزہ اردو فیسٹول 'کہکشاں' منعقد کیا گیا جس میں بڑی تعداد میں طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔ فیسٹول کے تحت سالانہ انٹر کالج غزل سرائی مقابلہ برائے غالب رنگ ٹرافی اور بیت بازی کا اہتمام کیا گیا۔ غزل سرائی مقابلے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے ہارون رشید نے اول مقام حاصل کیا جب کہ اسی شعبے کے عبدالودود کو حوصلہ افزا انعام سے نوازا گیا۔ دونوں کی مجموعی کارکردگی کی بنیاد پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کو غالب رنگ ٹرافی سے سرفراز کیا گیا۔ انفرادی مقابلے میں دوسرا انعام ذاکر حسین کالج (ایوننگ) کی خدیجہ آفتاب کے حصے میں آیا، جب کہ دیال سنگھ کالج کے عقیل حسین نے تیسرا مقام حاصل کیا۔ سینٹ اسٹیفنس کالج کی ابھیشکتا کو بہترین غزل سرائی پر حوصلہ افزا انعام دیا گیا۔

بیت بازی مقابلے میں سینٹ اسٹیفنس کالج کی علمہ شمیم، تسلیم ناز، ہرش وردھن اور شجاعت بشیر پر مشتمل ٹیم نے پہلا مقام حاصل کیا۔ ذاکر حسین کالج کی کیف مسعودی، نمرہ ناز، افراح تبسم اور رخسانہ پر مشتمل ٹیم دوسرے مقام پر رہی، جب کہ ذاکر حسین کالج (ایوننگ) کی خدیجہ آفتاب اور محمد مدثر پر مشتمل ٹیم تیسرے نمبر پر رہی۔ جیوری کے فرائض ڈی یو کے شعبۂ اردو کے سینئر استاد ڈاکٹر امتیاز احمد اور شعبۂ عربی کے ڈاکٹر مجیب اختر نے انجام دیے۔ بیت بازی کی نظامت ڈاکٹر شمیم احمد نے جب کہ غزل سرائی کی نظامت بنیامن اور اودیت سنگھ نے کی۔ واضح رہے کہ دونوں پروگراموں کے انعقاد کے لیے مالی تعاون غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی جانب سے عطا کیا گیا۔ (انقلاب۔دہلی)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

محسنہ قدوائی

نئی دہلی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی ہمشیرہ اور سابق مرکزی وزیر اور کانگریس کی بزرگ ترین رہنما محترمہ محسنہ قدوائی نے 7 اپریل 2026 کی شب تقریباً چار بجے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کے جسدِ خاکی کو عوام کے دیدار کے لیے نوئیڈا کے سیکٹر 4 میں واقع ان کی رہائش گاہ پر رکھا گیا جہاں ملکارجن کھڑگے، جے رام رمیش سمیت متعدد سینئر لیڈروں نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ بعد ازاں نمازِ عصر کے بعد بستی نظام الدین، نئی دہلی میں واقع پنج پیران قبرستان میں انھیں سپردِ خاک کیا گیا۔ ان کے جنازے میں لوک سبھا میں قائد حزبِ اختلاف راہل گاندھی، رکن پارلیمنٹ عمران پرتاپ گڑھی، مرزا جاوید علی، عبدالواحد قریشی، سابق میئر فرہاد سوری سمیت متعدد سیاسی وسماجی شخصیات نے شرکت کی۔ ان کی عمر 94 برس تھی۔ ان کے انتقال سے ادبی اور سیاسی دنیا میں غم کا ماحول ہے۔ محترمہ ایک علم دوست شخصیت تھیں اور سبھی کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی اور محبت سے پیش آتی تھیں۔ ان کے انتقال سے علمی اور سیاسی حلقوں میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ تادیر پُر نہ ہو سکے گا۔ وہ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود انجمن ترقی اردو بورڈ کے پروگراموں میں شرکت کرتی تھیں اور انجمن کے ترقیاتِ اردو کے منصوبوں کو بہ نظرِ تحسین دیکھتی تھیں۔ ان کی پیدائش یکم جنوری 1932 کو بارہ بنکی (اتر پردیش) کے ایک باوقار علمی خانوادے میں ہوئی تھی۔ ان کی شخصیت میں اودھی اور لکھنوی تہذیب رچی بسی تھی۔ وہ اعلا انسانی اور اخلاقی اقدار کا عملی نمونہ تھیں۔

محسنہ قدوائی نے آنجہانی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے ساتھ اپنا سیاسی کیریئر شروع کیا تھا اور وہ ان کے ساتھ وزیر بھی رہیں۔ بعد میں انھیں راجیو گاندھی کابینہ میں بھی شامل کیا گیا۔ وہ 1977 سے 1989 تک لوک سبھا اور 2004 سے 2016 تک راجیہ سبھا کی رکن رہیں۔ وہ مرکزی حج کمیٹی کی چیئرپرسن بھی رہیں۔ چند برس پہلے ان کی سوانح عمری انگریزی، ہندی اور اردو تینوں زبانوں میں شائع ہوئی ہے، جسے معروف انگریزی صحافی رشید قدوائی نے ترتیب دیا ہے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومہ کی مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

دہلی کی ایک شام رعنائیوں کے نام

نئی دہلی (31 مارچ)۔قومی راجدھانی دہلی کی ایک اداس شام اُس وقت حسین ہو کر رعنائیوں میں ڈوب گئی جب انقلاب اور ہمدرد نے ایک خوب صورت مشاعرے اور پُر تکلف ضیافت پر شہر کی اہم سماجی، سیاسی، ملّی، قانونی اور ادبی شخصیات کو پانچ ستارہ ہوٹل شانگریلا کے خوب صورت سبزہ زار پر جمع کر دیا۔ یہ موقع 'جشنِ ہمدرد، ایک شام انقلاب کے ساتھ' کا تھا۔ اس میں شعر وادب کی دنیا کی اہم شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا جن کے سامنے باذوق سامعین، خوب صورت محفل اور شانگریلا کے لان میں جلوہ افروز اہم مہمانانِ کرام تھے۔ اس خوب صورت محفل کو یادگار بنانے اور اپنے کلام سے قومی راجدھانی کی فضا کو مشکبار کرنے کے لیے استاد الشعرا پروفیسر وسیم بریلوی، نواز دیوبندی، ابرار کاشف، متین امروہوی، معین شاداب اور خوشبو شرما موجود تھے۔ قابلِ ذکر ہے کہ ہمدرد اور انقلاب کی رفاقت کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہیلتھ کوئز اور دیگر اسکیموں کے ساتھ دونوں ادارے نہ صرف عام لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں بلکہ ہر سال دس افراد کو عمرہ پر بھیج کر نیکی اور اجر کا کام انجام بھی دے رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ...(بقیہ صفحہ 6 ر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : اسفارِ زندگی (شعری مجموعہ)
شاعر : عقیل کنٹریکٹر طلب گار
اشاعت : 2025
ضخامت : 192 صفحات
قیمت : 400 روپے
ناشر : نیوز ٹاؤن پبلشرز، گیتا نگر، بالا جی چوک، میرا روڈ، تھانے (مہاراشٹر)-401107
تبصرہ نگار : ڈاکٹر ابراہیم افسر

E-mail: ibraheem.siwal@gmail.com

زیرِ نظر کتاب 'اسفارِ زندگی' عقیل کنٹریکٹر طلب گار کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ موصوف کی دل چسپی کورونا وبا (Covid-19) کے دوران اُردو زبان و ادب سے ہوئی۔ عقیل صاحب کی مادری زبان گجراتی ہے۔ لیکن اُردو زبان کی شیرینی نے انھیں اپنی جانب مائل کیا۔ اس سے قبل انھوں نے اپنے دلی جذبات و خیالات کی نشر و اشاعت انگریزی زبان میں کی تھی۔ انھوں نے ممبئی میں Poetry Circle Mumbai کی بنیاد 1986 میں ڈالی تھی جس میں صرف ممبئی کے انگریزی کے ادبا و شعرا شامل تھے۔ لیکن 2019 کے بعد جب ان کا رجحان rekhta.org کی جانب ہوا تو انھوں نے پایا کہ بہت سے اُردو شعرا کا کلام دیوناگری اور رومن رسمِ خط میں موجود ہے، اس لیے انھوں نے دیوناگری میں ہی اُردو شاعری کا مطالعہ کیا۔ لیکن کچھ دن بعد ہی انھیں احساس ہوا کہ اُردو میں شاعری یا اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے اُردو زبان سے واقف ہونا لازمی ہے۔ عقیل صاحب ممبئی میں اپنے اُردو داں دوستوں کی مدد سے اس شیریں اور ہر دل عزیز زبان پر مکمل دسترس حاصل کر کے 'طلب گار' تخلص کے ساتھ شعر و شاعری کرنے لگے۔ ان کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ آج ہمارے سامنے 'اسفارِ زندگی' کی شکل میں موجود ہے۔

عقیل کنٹریکٹر طلب گار نے اپنی تعلیم ممبئی کے Byculla Bombay Scottish اور christ church school orphange high school سے حاصل کی۔ 'اسفارِ زندگی' پر اشتیاق سعید صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے اس میں انھوں نے عقیل طلب گار کی شعری جہتوں اور ان کی جد و جہد کا احاطہ کیا ہے۔ ان کے مطابق عقیل صاحب کا 1986 میں پہلا انگریزی شاعری کا مجموعہ Sprit song کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد دوسرا شعری مجموعہ After Kalinga and other poems عنوان سے شائع ہوا۔ اُردو زبان سے واقفیت کے بعد انھوں نے دوستوں کی محفل میں انگریزی کے بجائے اُردو میں شعر پڑھنے شروع کیے۔ ابتدا میں اُردو شعری لفظیات پر ان کی دسترس کم تھی لیکن ریاض اور مشق سے انھوں نے اس پر ایک حد تک دسترس حاصل کر لی ہے۔ کہتے ہیں:

اُڑنا چاہے اُڑنے دو جہاں میں
دل پرندہ ہے، اُڑے گا آسماں تک

......

جرأت کہاں ہے اتنی کہ جی کا حال کہیں
کہنا تو بہت کچھ ہے سِوا اپنے حالوں میں

زیرِ نظر مجموعے میں عقیل کنٹریکٹر طلب گار نے اپنے دلی جذبات و احساسات کو خوب صورت الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ان کے اشعار کو پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کسی نو وارد شاعر کا کلام ہے۔ ہم ان کے اشعار میں ویسی ہی بالیدگی کو محسوس کرتے ہیں جو ایک پختہ گو شاعر کے یہاں موجود ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے اور اندازہ کیجیے کہ عقیل صاحب نے اپنی پروازِ تخیل کو کتنی وسعت عطا کی ہے:

روشنی مشعل میں ابھی باقی ہے
یعنی جا بہ جا زندگی باقی ہے

......

تری انجمن میں جب معشوق ہی نہیں
پھر چپکے چپکے کس کا دیدار کرتا ہوں

......

فہم و ادراک کے راستے بند کر دیے
یہ کیسا طریقہ ہے ستانے کے لیے

عقیل کنٹریکٹر طلب گار نے اس مجموعے میں کچھ نظمیں اور قطعات بھی شامل کیے ہیں۔ ان کی نظموں میں عام انسان کی ترجمانی و نمایندگی، حب الوطنی اور تہذیب و ثقافت کے دیدار جا بجا ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے قطعات میں حکمت و بصیرت آموز باتیں کہی ہیں۔ حالتِ حاضرہ پر کہا گیا قطعہ ملاحظہ کیجیے جس میں منزل، سفرِ حیات، تلاشِ حق اور یزداں سے متعلق تبادلۂ خیال کیا گیا ہے:

منزل کہاں، میرِ کارواں کون ہے
اس سفرِ حیات کا رہ رواں کون ہے
تلاشِ حق میں کہاں کہاں بھٹکا کیے
پھر بھی نہ جان پائے یزداں کون ہے

بہر نوع! عقیل کنٹریکٹر طلب گار نے اپنے پہلے شعری مجموعے سے قارئین کے درمیان یہ تاثر قائم کیا کہ انگریزی شاعری کے مقابلے اُردو شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اُردو غزلوں اور نظموں کے مداحین عوام و خواص دونوں ہیں۔ اُردو شاعری کا ایک خاص حلقہ برِّ صغیر کے علاوہ دیارِ غیر میں بھی موجود ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ انگریزی ادب کے سایے میں پرورش پانے والے شخص نے اُردو کے سحر و اثر کو قبول کیا۔ اس کے بعد وہ اُردو زبان و ادب کا طلب گار بن کر شاعری کے میدان میں اُتر جاتا ہے۔ یہی اُردو کی خوب صورتی ہے کہ اس کے مترنم اور پُرکشش الفاظ لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس موقعے پر راقم عقیل صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہے کہ محض چار پانچ سال کی مشق کے بعد 'اسفارِ زندگی' ہمارے سامنے موجود ہے۔ کتاب کا سرورق بہت ہی پُرکشش اور دیدہ زیب ہے۔ اس مجموعے کا انتساب ساحر لدھیانوی کے نام ہے۔ مجموعے کے آخر میں عقیل صاحب نے کتاب کو منصۂ شہود پر لانے کے لیے اشتیاق سعید کا شکریہ ادا کیا۔ کتاب کے فلیپ پر ہُنر رسول پوری اور سراج فاروقی نے اس مجموعے کی اہمیت و افادیت کے بارے میں اپنی قیمتی آرا رقم کی ہیں۔ ہُنر رسول پوری نے عقیل صاحب کی شاعری کے بارے میں لکھا کہ 'طلب گار کی شاعری میں رومانیت کہیں شبنم کے قطرے کی مانند جگمگاتی ہے تو کہیں کلیوں کی مانند مسکراتی ہے تو کہیں بادِ صبا کی مانند فرحت لٹاتے ہوئے خوش گامی سے گزر جاتی ہے۔ سراج فاروقی نے ان کی شعری جہتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا کہ 'طلب گار کی شعری کائنات میں سادگی و پُرکاری، شگفتگی و شائستگی، معنی آفرینی، دل کشی اور جاذبیت کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہی لوازم ان کے شعروں کو تازگی بخشتے ہیں جو قارئین اور سامعین دونوں ہی کے دل و دماغ میں اسی بہاؤ کے ساتھ اُترتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن انھیں ابھی مزید محنت کی ضرورت ہے، اس لیے کہ انھیں ابھی کئی ہفت خواں سر کرنے ہیں۔ امید ہے کہ اُردو شاعری کے مداحوں اور علمی و ادبی حلقوں میں 'اسفارِ زندگی' کی پذیرائی ہوگی۔ آخر میں عقیل صاحب کا شعر ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں نے زندگی کی جد و جہد کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے:

مسلسل چلتے رہنا ہی سفر ہوتا ہے
کاروانِ حیات یوں ہی بسر ہوتا ہے

◆◆

دھلی کی ایک شام رعنائیوں کے نام

(بقیہ صفحہ 5 سے آگے)

سیکڑوں افراد میں انعامات تقسیم کر کے ان کے اندر صحت کے تئیں بیداری بھی پیدا کر رہے ہیں۔ مشاعرے نے ماحول میں لفظوں کی خوشبو اور فکر کی گہرائی بکھیر دی۔ ہمدرد لیباریٹریز کے چیئرمین عبدالمجید ثانی، دینک جاگرن کے سی جی ایم شیلندر سریواستو، انقلاب کے ایڈیٹر ودود ساجد، ماکیٹنگ ہیڈ عارف محمد خاں اور ہمدرد و انقلاب کی کور ٹیم کے ممبران نے انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے مہمانوں کا استقبال کیا۔

پروگرام کے آغاز میں ایڈیٹر انقلاب ودود ساجد نے کہا کہ گرچہ یہ شعر و ادب کی محفل ہے اور تقریر کا کوئی موقع نہیں، لیکن وہ یہ ضرور وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح ہمدرد پریشانی اور بیماری میں عام لوگوں کا ہمدرد اور ساتھی بنتا ہے یہی کام ہم روزنامہ انقلاب کے ذریعے بھی کرتے ہیں اور ملک و معاشرے کی خدمت سے کوئی دریغ نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ ادبی محفلیں نہ صرف انسانی طبیعت کو ہشاش بشاش کر دیتی ہیں بلکہ یہ ذہنی و فکری تربیت کا ایک ذریعہ بھی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ پہلا تجربہ ہے کہ ہم ہمدرد کے ساتھ مل کر اس طرح کی محفل آراستہ کر رہے ہیں۔ مستقبل میں بھی اس طرح کی محفلیں منعقد کی جاتی رہیں گی تاکہ اہلِ ذوق اور ادب نواز لوگوں کی خدمت کی جا سکے۔ اس موقعے پر پروفیسر وسیم بریلوی، نواز دیوبندی، کاشف ابرار، معین شاداب، خوشبو شرما نے شرکت کی۔ تقریب کے اختتام پر ہمدرد مارکیٹنگ ہیڈ محمد زبیر اور انقلاب کے مارکیٹنگ ہیڈ عارف محمد خاں نے شعرا کا شکریہ ادا کیا۔

(انقلاب۔ دہلی)

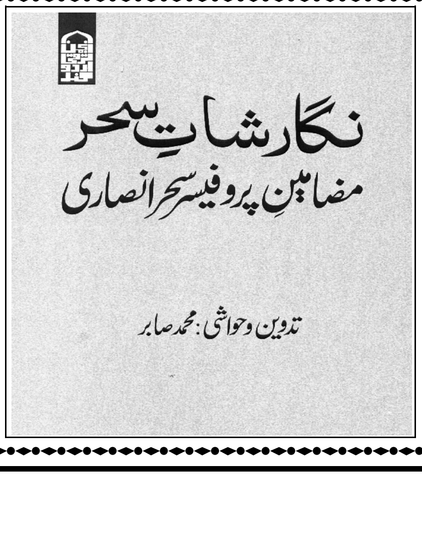

نگارشاتِ سحر

(مضامینِ پروفیسر سحر انصاری)

تدوین و حواشی: محمد صابر

ضخامت: 208 صفحات

قیمت: 250 روپے

کیا سرقہ کرنے والا بڑا شاعر کہلائے گا (افتخار عارف پر میرا مقدمہ ادب کی عدالت میں)

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

اوراب افتخار عارف کی غزل دیکھیے:

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا
اس ایک خواب کی حسرت میں جل بجھیں آنکھیں
وہ ایک خواب کہ اب تک نظر نہیں آیا
کریں تو کس سے کریں نارسائیوں کا گلہ
سفر تمام ہوا ہم سفر نہیں آیا
دلوں کی بات بدن کی زباں سے کہہ دیتے
یہ چاہتے تھے مگر دل ادھر نہیں آیا
عجیب ہی تھا مرے دور گمرہی کا رفیق
بچھڑ گیا تو کبھی لوٹ کر نہیں آیا
حریم لفظ و معانی سے نسبتیں بھی رہیں
مگر سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں آیا

(مجموعۂ کلام 'مہرِ دونیم' اشاعت اگست 1983، حسین پبلشرز، لندن)

میرے اس مقدمے کی نوعیت محض تاثراتی نہیں بلکہ تقابلی مواد، بنیاد اور فنی شہادتوں پر قائم ہے، اس لیے اس کا جواب بھی تاثراتی ردِّعمل کے بجائے ایک ایک شعر کی سطح پر زمین، ردیف، قافیہ، نحوی ساخت، استعاراتی سمت اور فکری حرکت کو سامنے رکھ کر دینا ضروری ہے۔ ذیل میں دونوں غزلوں کا شعر بہ شعر تقابلی وتنقیدی جائزہ پیش ہے تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ کہاں تخلیقی استفادہ ختم ہو کر جبری اتباع اور پھر سرقے کی صورت اختیار کرتا چلا گیا ہے۔

1- مطلعے کی سطح پر مماثلت

سحر انصاری:

کہیں وہ چہرۂ زیبا نظر نہیں آیا
گیا وہ شخص تو پھر لوٹ کر نہیں آیا

افتخار عارف:

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

یہاں بظاہر الفاظ مختلف ہیں مگر نحوی سانچہ، اختتامی مصرعے کی ساخت (نہیں آیا)، اور مرکزی احساس (عدمِ واپسی، محرومی) ایک ہی نفسیاتی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ سحر کے ہاں شخصی اور حسی تجربہ ہے، جب کہ اتے بھائی المعروف بہ افتخار عارف کے ہاں اسی سانچے کو قدرے عمومی اور تجریدی بنا کر رکھا گیا ہے، جو تخلیق نہیں بلکہ تبدیل (Surface Modification) ہے۔

2- 'ہم سفر نہیں آیا' براہِ راست گرفت

سحر انصاری:

کہوں تو کس سے کہوں آ کے اب سرِ منزل
سفر تمام ہوا، ہم سفر نہیں آیا

افتخار عارف:

کریں تو کس سے کریں نارسائیوں کا گلہ
سفر تمام ہوا ہم سفر نہیں آیا

یہاں کوئی تاویل ممکن نہیں۔ یہ لفظی سرقہ ہے۔ صرف پہلے مصرعے میں معمولی رد و بدل ہے، دوسرا مصرع بعینہٖ نقل ہے۔ نہ یہ تضمین ہے، نہ حوالہ، نہ شعوری مکالمہ؛ یہ خالص سرقہ ہے۔

3- خواب اور نظر نہ آنے کا استعارہ

سحر انصاری:

پھر ایک خواب وفا بھر رہا ہے آنکھوں میں
یہ رنگ ہجر کی شب جاگ کر نہیں آیا

افتخار عارف:

اس ایک خواب کی حسرت میں جل بجھیں آنکھیں
وہ ایک خواب کہ اب تک نظر نہیں آیا

یہاں خواب، آنکھ، انتظار اور عدمِ حصول کا پورا استعاراتی پیکج وہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سحر کے ہاں خواب وفا سے جڑا ہے اور ہجر کی شب کا تجربہ بن جاتا ہے، جب کہ افتخار عارف سے براہِ راست سرقے سے بچانے کی غرض سے اسے کم گہرائی کے ساتھ حسرت میں سمیٹتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ معنوی استحصال (Concepual Borrowing) ہے۔

4- لوٹ کر نہ آنے والا رفیق

سحر انصاری:

کہیں وہ چہرۂ زیبا نظر نہیں آیا
گیا وہ شخص تو پھر لوٹ کر نہیں آیا

افتخار عارف:

عجیب ہی تھا مرے دورِ گمرہی کا رفیق
بچھڑ گیا تو کبھی لوٹ کر نہیں آیا

یہاں 'شخص' کو رفیق میں بدل دیا گیا ہے مگر حرکی صورت، انجام اور جذباتی نتیجہ ایک ہی ہے۔ یہ تخلیقی ارتقا نہیں بلکہ کردار کی تبدیلی کے ذریعے ایک ہی منظر کی نقل ہے۔

5- سلیقۂ عرضِ ہنر، فکری مرکز پر قبضہ

سحر انصاری:

مرے لہو کو مری خاکِ ناگزیر کو دیکھ
یوں ہی سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں آیا

افتخار عارف

حریمِ لفظ و معانی سے نسبتیں بھی رہیں
مگر سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں آیا

یہاں تو معاملہ اور بھی واضح ہے۔ 'سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں آیا' ایک کلیدی فکری مصرع ہے جسے افتخار عارف نے پورے سیاق سے الگ کر کے اپنی غزل میں جوڑ دیا ہے۔ یہ نہ زمین کی مجبوری ہے نہ روایت۔ ایک طرف تو یہ شعری مرکزیت کی چوری ہے اور دوسری طرف نالائقی کا وہ اعتراف ہے جو دو نمبر شاعروں کے منہ سے خود شاعری کرواتی ہے۔

دونوں غزلوں کی زمین (نہیں آیا)، بیانیہ ترتیب، محرومی، سفر، خواب، رفیق، واپسی، اور ہنر کی ناقدری، سب کچھ ایک ہی فکری دھارے میں بہتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سحر انصاری کے ہاں یہ تجربہ اندر سے پھوٹتا ہے، جب کہ افتخار عارف کے ہاں وہی مواد ادھار لی گئی داخلی کیفیت بن کر سامنے آتا ہے۔

یہ معاملہ محض 'اثر قبول کرنے' یا عصری فضا کا نہیں، بلکہ منظّم، مسلسل، شعوری اور چالاکی پر مبنی استفادے کا ہے جس میں ایک دو مصرع تو بعینہٖ نقل ہیں جب کہ کئی اشعار معنوی و نحوی سطح پر جبراً مستعار ہیں، اور غزل کی فکری مرکزیت یعنی ریڑھ کی ہڈی سحر انصاری سے لی گئی ہے۔

اس نوعیت کی شاعری کو ادبی تنقید میں نان جینوئن پریکٹس اور عام زبان میں دو نمبری کہا جاتا ہے، جہاں شاعر اپنی شناخت دوسروں کے کلام کے سہارے قائم کرتا ہے اور پھر اسی روایت کے اصل معماروں کے راستے کاٹنے لگتا ہے۔

Mob. 03214468216

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین ومقالات) ڈاکٹر ماجد دیوبندی		300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتا نجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرور الہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال) مترجم: سیّد وجاہت مظہر		500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من وتو (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات ومضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق وتوازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری وتاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتا نجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-
یہ تو عشق کا ہے معاملہ	ڈاکٹر ہلال فرید	300/-
جب دیوں کے سر اُٹھے	ڈاکٹر ہلال فرید	360/-
سیر المنازل (مرزا سنگین بیگ)	شریف حسین قاسمی	600/-
محرابِ تمنا	فطرت انصاری	200/-
مکتوباتِ مولوی عبدالحق بنام مشاہیر...	میر حسین علی امام، یاسمین سلطانہ فاروقی	700/-
لفظ (کلیاتِ زہرا نگاہ)	زہرا نگاہ	500/-
In This Live Desolation (Autobiography of Akhtarul Iman)	ترجمہ: بیدار بخت	500/-
سخنِ افتخار (کلیاتِ افتخار عارف)	افتخار عارف	1500/-
گواہی (شاعری)	گوہر رضا	500/-
میری زمین کی دھوپ (ہندی)	ونود کمار ترپاٹھی بشر	400/-
کھُلا دروازہ	ڈاکٹر نریش	250/-
ٹیپو سلطان کا خواب (گریش کرناڈ)	محبوب الرحمان فاروقی	300/-
اپنی دنیا آپ پیدا کر	غلام حیدر	900/-

کیا اب سرقہ کرنے والا بڑا شاعر کہلائے گا

افتخار عارف پر میرا مقدمہ ادب کی عدالت میں

فرحت عباس شاہ

سرقے اور شعری فریب کاری جیسے موضوع کو اگر محض ذاتی رائے یا وقتی جذباتی ردِّعمل سمجھ لیا جائے تو یہ علمی ناانصافی ہوگی، اس لیے ضروری ہے کہ اسے ادبی اصولوں، روایت، اور تنقیدی معیارات کی روشنی میں دیکھا اور سمجھا جائے۔ اصل میں اوریجنل شاعر اور نان اوریجنل شاعر کے فرق کو سمجھے بغیر سرقے کا مسئلہ کبھی واضح نہیں ہوسکتا۔ اوریجنل شاعر لازماً اپنے عہد، اپنے ماحول، اپنی روایت اور اپنے پیش روؤں سے سیکھتا ہے، ان سے اثر قبول کرتا ہے اور اسی اثر کو اپنی ذات، اپنے تجربے اور اپنی داخلی کائنات میں جذب کر کے ایک نئی تخلیقی صورت میں پیش کرتا ہے۔ یہی عمل تخلیقی استفادہ کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس نان اوریجنل شاعر نہ صرف خیال، مضمون یا جذبہ مستعار لیتا ہے بلکہ اکثر اوقات شعر کا پورا دروبست، نحوی ساخت، فکری زاویہ اور حتیٰ کہ مرکزی مصرع تک چرا لیتا ہے، اور پھر اس سرقے کو اپنی فنی عظمت کا ثبوت بنا کر پیش کرتا ہے، جو تخلیق نہیں بلکہ ادبی جعل سازی ہے۔

افتخار عارف کے حوالے سے سرقے، خوشامد، درباری ذہنیت اور احسان فراموشی کی بات کوئی واحد یا انفرادی آواز نہیں رہی، یہ ایک ایسا عمومی تاثر بن چکا ہے جسے نظر انداز کرنا خود ادبی دیانت کے خلاف ہے۔ جب کسی شاعر کے بارے میں مختلف زمانوں، مختلف حلقوں اور مختلف مزاج کے قارئین و ناقدین ایک ہی نوعیت کی شکایات دہرا رہے ہوں تو وہاں خاموشی خود ایک سوال بن جاتی ہے۔ اس تناظر میں افتخار عارف کی زیرِ بحث غزل کا سحر انصاری کی غزل کے بالمقابل آنا محض اتفاق نہیں بلکہ ایک مستند شہادت ہے جو پورے مسئلے کو عیاں کر دیتی ہے۔

اگر دونوں غزلوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بات صرف زمین، ردیف یا قافیہ کی مشابہت تک محدود نہیں رہتی بلکہ فکری سمت، جذباتی سفر، استعاروں کی ترتیب اور مرکزی تجربے کی نوعیت تک پھیل جاتی ہے۔ سحر انصاری کی غزل ایک داخلی، ذاتی اور وجودی تجربے سے جنم لیتی ہے جہاں سفر، ہم سفر، خواب، ہجر اور ہنر کی ناقدری سب ایک ہی داخلی کرب سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس افتخار عارف کی غزل میں وہی عناصر ایک ایسے سانچے میں ڈھالے گئے ہیں جو پہلے سے تیار شدہ محسوس ہوتا ہے، گویا شاعر نے تخلیق سے پہلے ایک مکمل نقشہ سامنے رکھ لیا ہو اور پھر اسی کے اندر الفاظ کو ادھر اُدھر فِٹ کر دیا ہو۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں تخلیقی استفادہ ختم ہو کر جبری اتباع اور پھر واضح سرقے میں بدل جاتا ہے۔ خصوصاً وہ مقامات جہاں پورے کا پورا مصرع بعینہٖ نقل ہو، یا جہاں کسی غزل کا فکری مرکز... جیسے 'سفر تمام ہوا ہم سفر نہیں آیا' یا 'سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں آیا'... بغیر کسی شعوری مکالمے یا حوالہ جاتی دیانت کے دوسری غزل میں منتقل کر دیا جائے، وہاں کسی بھی سنجیدہ تنقیدی معیار کے تحت دفاع ممکن نہیں رہتا۔ یہ نہ روایت کا حصہ ہے، نہ تضمین، نہ جوابِ غزل، بلکہ محض اس سہولت پسندی کا اظہار ہے جو کمزور اور نان جینوئن شاعر کو وقتی شہرت تو دے سکتی ہے مگر ادب کے سامنے اسے برہنہ بھی کر دیتی ہے۔

> جب کسی شاعر کے بارے میں مختلف زمانوں، مختلف حلقوں اور مختلف مزاج کے قارئین و ناقدین ایک ہی نوعیت کی شکایات دہرا رہے ہوں تو وہاں خاموشی خود ایک سوال بن جاتی ہے۔ اس تناظر میں افتخار عارف کی زیرِ بحث غزل کا سحر انصاری کی غزل کے بالمقابل آنا محض اتفاق نہیں بلکہ ایک مستند شہادت ہے جو پورے مسئلے کو عیاں کر دیتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ سنگین پہلو یہ ہے کہ ایسے شاعر اکثر انہی لوگوں کے راستے کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے انھوں نے فکری یا شعری مواد مستعار لیا ہوتا ہے۔ ادبی اداروں، ایوانوں اور طاقت کے مراکز سے قربت پیدا کر کے اصل تخلیقی آوازوں کو حاشیے پر دھکیل دینا محض شخصی اخلاقیات کا مسئلہ نہیں بلکہ پورے ادبی کلچر کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں سرقے کا مسئلہ صرف ایک شاعر یا ایک غزل تک محدود نہیں بلکہ ایک ایسی روش بن چکا ہے جس کے خلاف علمی اور تنقیدی سطح پر بات کرنا ناگزیر ہو چکا ہے۔

چناں چہ زیرِ بحث مضمون کا مقصد کسی فرد کی کردار کشی نہیں بلکہ ایک ادبی رویے کی نشان دہی ہے۔ جب ایک غزل دوسری غزل کے نیچے اوندھے منہ پڑی محسوس ہو، جب ہزار کوشش کے باوجود وہ اس کے نیچے سے سرک نہ پائے، تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ تخلیق کی بنیاد کمزور ہے اور سہارا کسی اور کی فکری عمارت کا لیا گیا ہے۔ اردو ادب کی صحت مند روایت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے معاملات کو شخصی عقیدت یا ادارہ جاتی خوف کے بغیر، خالصتاً کلام کی بنیاد پر پرکھا جائے، کیوں کہ آخر کار ادب میں فیصلہ نام کا نہیں بلکہ کلام کا ہوتا ہے۔

سحر انصاری کی غزل دیکھیے:

کہیں وہ چہرۂ زیبا نظر نہیں آیا
گیا وہ شخص تو پھر لوٹ کر نہیں آیا
کہوں تو کس سے کہوں آ کے اب سرِ منزل
سفر تمام ہوا، ہم سفر نہیں آیا
صبا نے فاش کیا رمزِ بوے گیسوے دوست
یہ جرم اہلِ محبت کے سر نہیں آیا
پھر ایک خواب وفا بھر رہا ہے آنکھوں میں
یہ رنگ ہجر کی شب جاگ کر نہیں آیا
کبھی یہ زعم کہ خود آ گیا تو مل لیں گے
کبھی یہ فکر کہ وہ کیوں ادھر نہیں آیا
میں وہ مسافر دشتِ غمِ محبت ہوں
جو گھر پہنچ کے بھی سوچے کہ گھر نہیں آیا
مرے لہو کو مری خاکِ ناگزیر کو دیکھ
یونہی سلیقۂ عرض ہنر نہیں آیا
فغاں کہ آئینہ و عکس میں بھی دنیا کو
رفاقتوں کا سلیقہ نظر نہیں آیا
مآلِ ضبط تمنا سحر پہ کیا گزری
بہت دنوں سے وہ آشفتہ سر نہیں آیا

(مجموعۂ کلام 'نمود' اشاعت اگست 1976، ناشر، ادبستان جدید کراچی)

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران : منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***